توجہ اور غور کے قابل ہے جس میں ''ربا'' (سود) کا ذکر بمقابلہ صدقات آیا ہے:

﴿وَمَا اٰتَیْتُمْ مِّنْ رِّبًا لِّیَرْبُوَا فِیْ اَمْوَالِ النَّاسِ فَلَا یَرْبُوْا عِنْدَ اللّٰهِ ۚ وَمَا اٰتَیْتُمْ مِّنْ زَكٰوةٍ تُرِیْدُوْنَ وَجْهَ اللّٰهِ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُضْعِفُوْنَ۝﴾

''اور جو تم دیتے ہو سود پر کہ بڑھتا رہے لوگوں کے مال میں سو وہ نہیں بڑھتا اللہ کے یہاں' اور جو دیتے ہو زکوٰۃ سے اللہ کی رضامندی چاہتے ہوئے' سو یہ وہی ہیں جو (اپنے مال کو) بڑھانے والے ہیں۔''

گویا دین کی روحانی تعلیم کے اعتبار سے ''ربا'' درحقیقت صدقہ اور خیرات کے بالمقابل ہے۔ مثال کے طور پر ایک شخص کہیں ملازم ہے اور اس کو ماہانہ تنخواہ ملتی ہے جس سے اس کی ضروریات پوری ہو رہی ہیں لیکن کچھ اضافی سرمایہ اس کے پاس جمع ہو گیا ہے۔ اس فاضل سرمایہ کے دو مصرف ہیں۔ ایک تو یہ کہ اس کو کسی اور کے کاروبار میں لگا کر اس کی محنت کے بل بوتے پر اس سرمایہ کو بڑھائے (وہ خود تو محنت نہیں کرے گا کیونکہ وہ تو کسی اور جگہ ملازم ہے) تو اگرچہ یہ قانونی اور فقہی سطح پر جائز اور درست ہے لیکن روحانی سطح پر یہ بھی ''ربا'' ہی قرار پائے گا' کیونکہ اس روحانی اور اخلاقی سطح پر اس فاضل سرمائے کا صحیح مصرف یہ ہے کہ اوّل تو اس کا مالک ہی محتاجوں اور غریبوں کو بنا دیا جائے' یعنی ایسے لوگوں کو دے دیا جائے جو محروم ہیں یا جن کے پاس کاروبار کے لئے بنیادی سرمایہ موجود نہیں ہے' یا بدرجۂ آخر ''قرضِ حسن'' کی صورت میں دے دیا جائے تاکہ وہ اس کے ذریعے اپنا کاروبار چلا کر اسے واپس لوٹا دیں۔ اس سے آگے بڑھ کر فاضل سرمائے کو مزید آمدنی کا ذریعہ بنانا قانونی سطح پر تو جائز ہو سکتا ہے مگر روحانی اور اخلاقی سطح پر یہ چیز بھی ممنوعات کی فہرست میں داخل ہے۔

اسلام کا قانونی نظام معیشت

اخلاقی اور روحانی یا قرآن وحدیث کی مخصوص اصطلاح میں ایمانی اور احسانی سطح پر اسلام کی معاشی تعلیمات کے ضمن میں دو امور تو اس سے قبل واضح کئے جا چکے ہیں، یعنی:

۱) ایک یہ کہ یہ ایک مکمل معاشی نظریہ اور نظام ہے جس کے چار بنیادی اصول یہ ہیں کہ (i) اس پوری کائنات میں ملکیت کا کامل اور مطلق حق صرف اللہ کو حاصل ہے، انسان کو یہ حق نہ انفرادی سطح پر حاصل ہے نہ اجتماعی یا قومی سطح پر، بلکہ انسان کو صرف حق ''امانت'' حاصل ہے۔ (ii) اس دنیا میں کسی انسان کو جو کچھ ملتا ہے، خواہ اس کے لئے اس نے خود شدید محنت کی ہو اور مشقت جھیلی ہو، وہ اس کی ''کمائی'' نہیں بلکہ اللہ کا ''فضل'' ہے۔ (iii) اس فضل خداوندی میں سے انسان کا جائز حق صرف اس کی ''ضروریات'' کی حد تک ہے۔ (iv) اس سے زائد جو کچھ ہے وہ اُس کا نہیں بلکہ حقیقت میں فقراء اور مساکین یا سائلین اور محرومین کا حق ہے جو اُس کے مال میں صرف اس امتحان کی غرض سے شامل کر دیا گیا ہے کہ دیکھیں کہ آیا وہ پوری امانت داری کے ساتھ اصل حق داروں کو ان کا حق پہنچا کر سبکدوش اور سرخرو ہو جاتا ہے یا اس پر اپنے ''قبضہ مخالفانہ'' کے ذریعے اپنے آپ کو اخلاق کی بالیدگی اور روحانی ترفع سے محروم کر لیتا ہے۔

۲) دوسرے یہ کہ نبی اکرم ﷺ اور بہت سے صحابہؓ نے اسی ''اختیاری فقر'' کو اپنا شعار بنائے رکھا۔ اور دورِ صحابہؓ کے بعد اولیاء اللہ اور صوفیائے کرام نے بھی ع ''مراطریق امیری نہیں، فقیری ہے!'' کے مصداق اسی سطح پر زندگیاں بسر کیں۔ البتہ یہ واضح رہنا چاہئے کہ یہ معاملہ خالص اختیاری (Voluntary) ہے۔ اور

اس میں قانونی یا ریاستی جبر کا ادنیٰ شائبہ بھی شامل ہو جائے تو نہ صرف یہ کہ اس کا اصل ''حسن'' ختم ہو جائے گا بلکہ اس کا بنیادی مقصد ہی فوت ہو کر رہ جائے گا۔

ان دو امور پر ایک تیسری حقیقت کا اضافہ کر لیا جائے۔ اور وہ یہ کہ اگرچہ اس سطح پر زندگی بسر کرنا بلاشبہ ایک نہایت اقل قلیل اقلیت ہی کے لئے ممکن ہے' لیکن واقعہ یہ ہے کہ اگر کسی معاشرے میں لاکھوں میں سے ایک شخص بھی اس سطح پر زندگی گزار رہا ہو تو ایسے لوگ اس معاشرے میں اخلاقی اور روحانی اقدار کے زندہ اور برقرار رکھنے کا مؤثر ذریعہ بن جاتے ہیں اور انہیں گویا اس معاشرے میں ایک قسم کے اخلاقی و روحانی Pace-makers کی حیثیت حاصل ہو جاتی ہے۔ اس لئے کہ عوام الناس میں ہر دلعزیزی اور مقبولیت انہیں حاصل ہوتی ہے نہ کہ اصحاب دولت اور ارباب اقتدار کو۔ اور حقیقی معنی میں تعظیم اور تکریم ان کی ہوتی ہے نہ کہ صاحبانِ تخت و تاج اور اصحاب دولت و ثروت کی' بلکہ بسا اوقات بڑے بڑے شہنشاہ اور کج کلاہ ان خرقہ پوش اور بوریا نشین فقیروں کے در پر حاضری کو اپنے لئے موجب سعادت سمجھتے ہیں۔ جیسے کہ بالکل صحیح فرمایا علامہ اقبال نے کہ ؎

یقیں پیدا کر اے ناداں' یقیں سے ہاتھ آتی ہے
وہ درویشی کہ جس کے سامنے جھکتی ہے فغفوری!

چنانچہ نہایت مشہور واقعہ ہے کہ حج کے موقع پر لوگوں کا رجوع عام اور خلقت کا اژدھام ایک صاحب علم و فضل کے گرد دیکھ کر ہارون الرشید جیسے عظیم حکمران سے اس کی محبوب بیگم ملکہ زبیدہ نے کہا تھا: ''اصل حکومت تو ان کی ہے نہ کہ تمہاری!'' پھر چند سو سال بعد کا واقعہ ہے کہ برعظیم ہند کے پایۂ تخت دہلی میں طویل عرصے تک دو متوازی حکومتیں قائم رہیں' ایک سیاسی اور عسکری حکومت اور دوسری اخلاقی اور روحانی حکومت' اور مؤخر الذکر حکومت کے ایک ''تاجدار'' سلطان الہند حضرت نظام الدین اولیاء کے ''عہد حکومت'' کے دوران چھ یا سات بادشاہ سیاسی اور عسکری حکومت کے تخت پر بیٹھے' لیکن نہ صرف یہ کہ حضرت نظام الدین نے کبھی کسی بادشاہ کے دربار میں حاضری نہیں دی بلکہ

بعض کی شدید خواہش کے باوجود انہیں اپنے یہاں حاضر ہونے کی اجازت بھی مرحمت نہیں فرمائی..... اور یہ تو بالکل ماضی قریب کا واقعہ ہے کہ گزشتہ صدی کے دوران سلسلہ مجددیہ نقشبندیہ کے بزرگ حضرت شاہ غلام علیؒ نے ریاست ٹونک کے والی نواب امیر خان کی جانب سے خانقاہ کے مصارف کے لئے ایک جاگیر کا وثیقہ اس کی پشت پر یہ شعر لکھ کر واپس کر دیا تھا کہ۔

ما آبروئے فقر و قناعت نہ باختیم
با میر خاں بگوئے کہ روزی مقدر است

یعنی ''ہم یہ جاگیر قبول کر کے اپنے فقر اور درویشی کی عزت و آبرو کا سودا کرنے کو تیار نہیں ہیں۔ امیر خان سے کہہ دیا جائے کہ ہماری روزی ہمارے پروردگار کی جانب سے مقرر ہے''۔

چنانچہ واقعہ یہ ہے کہ آج ہم قومی سطح پر اخلاق کے جس خوفناک زوال اور روحانیت کے جس شدید فقدان سے دوچار ہیں اس کا ایک اہم سبب یہی ہے کہ آج لاکھوں کیا کروڑوں میں بھی کوئی ایک انسان اس سطح پر زندگی گزارتا نظر نہیں آتا۔ نتیجہ یہ ہے کہ ہمارے معاشرے میں عزت و احترام کی بنیاد صرف دولت و ثروت اور حکومت و اقتدار بن کر رہ گئے ہیں' حالانکہ لوگوں کو خوب معلوم ہوتا ہے کہ یہ دولت حرام اور ناجائز ذرائع سے کمائی گئی ہے اور یہ اقتدار بھی ''دھن' دھونس اور دھاندلی'' کے ذریعے حاصل کیا گیا ہے۔

اور اب آیئے قانونی اور فقہی سطح پر اسلام کی معاشی تعلیمات کی جانب! جیسے کہ اس سے قبل عرض کیا جا چکا ہے' قانونی سطح پر اسلام کا معاشی نظام ایک محدود اور مقید (Controlled) اور اندرونی طور پر منضبط (Internally Managed) سرمایہ دارانہ معیشت (Capitalism) کی حیثیت رکھتا ہے۔

تو آیئے کہ سب سے پہلے یہ دیکھیں کہ یہ ''کیپٹل ازم'' سے کیوں اور کیسے مشابہ ہے؟ یہ بنیادی طور پر کیپٹل ازم سے اس لئے مشابہ ہے کہ اس میں وہ چاروں بنیادی

اوصاف موجود ہیں جو مغرب کے سرمایہ دارانہ معاشی نظام میں بھی موجود ہیں اور درحقیقت ان ہی کی بنیاد پر اسے کمیونزم پر وہ فیصلہ کن فتح حاصل ہوئی ہے جس کا جشن آج پوری مغربی دنیا اور خصوصاً اس کے امام اور قائد امریکہ میں جوش وخروش سے منایا جا رہا ہے۔ اس لئے کہ ان اوصاف کے ذریعے ایک جانب انسان کی بعض حیوانی جبلتوں کو بھرپور تسکین حاصل ہو جاتی ہے تو دوسری جانب ایک مسلسل مقابلے اور مسابقت کا بازار گرم رہتا ہے جس کے باعث معاشی میدان میں تیز رفتاری اور حرکت پیدا ہو جاتی ہے اور ہر نوع کی پیداوار میں اضافہ ہو جاتا ہے۔ وہ چار بنیادی اوصاف حسب ذیل ہیں:

۱) جملہ عملی اور قانونی تقاضوں کے اعتبار سے ذاتی اور نجی ملکیت (Private ownership) کا اثبات، جو صرف اشیائے صرف یعنی استعمال کی چیزوں ہی پر نہیں، جملہ ذرائع پیداوار جیسے کھیت، دکان اور کارخانہ پر بھی حاوی ہے۔

۲) ذاتی منفعت اور شخصی مفاد کے باعث اضافی محنت ومشقت اور زیادہ جان مار کر کام کرنے کا جذبہ یعنی ذاتی حوصلہ مندی (Personal Incentive) جس سے پیداوار میں اضافہ ہوتا ہے۔ پھر اس پر مستزاد کھلا مقابلہ اور آزادانہ مسابقت (Open competition) جس سے نفع کی شرح خود بخود کم ہو جاتی ہے اور صارفین کو فائدہ پہنچتا ہے۔

۳) اشیاء کی قیمتوں کے تعین میں کسی مصنوعی کنٹرول کی بجائے طلب (Demand) اور رسد (Supply) کے عوامل کا آزادانہ بروئے کار آنا، یعنی ''منڈی کی معیشت'' (Market Economy) کا اصول!

۴) اسی طرح آجری اور مستاجری یعنی کارکنوں کی مزدوری اور ملازمت کے معاملات میں بھی مصنوعی پابندیوں اور قدغنوں سے اجتناب۔ اور ملازم رکھنے والوں (Employers) کے لئے ''رکھنے یا فارغ کر دینے'' کی کھلی آزادی یعنی Hire and Fire کا آزادانہ اختیار (بشرطیکہ اس کے ساتھ ''بیروزگار'' لوگوں

کے لئے ریاستی کفالت کی ضمانت موجود ہو!)

جیسے کہ اوپر عرض کیا جا چکا ہے' ان چاروں چیزوں کا نہایت گہرا تعلق انسان کی حیوانی جبلتوں کے ساتھ ہے اور یہ انسانی سرشت کے ساتھ کامل مطابقت رکھتی ہیں۔ چنانچہ ان ہی کو نظر انداز کر کے کمیونزم نے گویا اپنے ہاتھوں اپنی قبر کھودی ہے۔ اور ان ہی کے باعث مغرب کے سرمایہ دارانہ نظام کو وہ فتح حاصل ہوئی ہے جس پر وہ بغلیں بجا رہا ہے حالانکہ واقعہ یہ ہے کہ بعض دوسرے اعتبارات سے مغرب کی سرمایہ دارانہ معیشت نہایت ظالمانہ اور حد درجہ استحصالی مزاج کی حامل ہے۔ چنانچہ کمیونزم کا ظہور بذاتِ خود سرمایہ دارانہ نظام کے اسی ظلم اور استحصال کے خلاف ''ردِّعمل'' کی حیثیت رکھتا تھا جو ''انتہائے سادگی سے کھا گیا مزدور مات!'' کے مصداق ردِّعمل کی طبعی و فطری انتہا پسندی کی بنا پر شکست کھا گیا۔ اس لئے کہ اس نے اپنی اس انتہا پسندی کے باعث انسان کی حیوانی جبلتوں کو نظر انداز کر دیا۔

بہر حال اسلام کے قانونی نظامِ معیشت میں یہ چاروں اصول بتمام و کمال موجود ہیں جن کی بناء پر اسے مغرب کی سرمایہ دارانہ معیشت کے ساتھ ایک گونہ مماثلت حاصل ہے۔

اب ہماری اصل گفتگو تو شریعت اسلامی کے ان احکام اور اقدامات کے بارے میں ہو گی جن کی بناء پر ہم اسلام کے قانونی نظامِ معیشت کو ''محدود اور مقید'' سرمایہ دارانہ معیشت قرار دیتے ہیں۔ اور جن کا اصل مصرف اور بنیادی مقصد یہ ہے کہ معیشت کے میدان میں ''سرمایہ کاری'' کی فضا تو بھرپور طور پر برقرار رہے لیکن ''سرمایہ'' استحصال کا آلہ نہ بن جائے اور ''سرمایہ داری'' آکاس بیل کی صورت اختیار کر کے پوری معیشت کا خون نہ چوس لے' لیکن مناسب ہے کہ پہلے اس دوسرے پہلو پر غور کر لیا جائے جو بنیادی طور پر تو اسلام کے قانونی نظامِ معیشت اور مغرب کے سرمایہ دارانہ نظام میں قدرِ مشترک کے طور پر موجود ہے' تاہم متعدد اعتبارات سے ان کے مابین ''چہ نسبت خاک را با عالم پاک'' والا معاملہ ہے اور وہ ہے سرمایہ دارانہ نظام کا داخلی انضباط۔

اس کی جڑ اور بنیاد یہ ہے کہ جہاں بھی شخصی ملکیت' ذاتی حوصلہ مندی اور آزادانہ مسابقت کا معاملہ ہوگا' لوگوں کے مابین ذہانت وصلاحیت اور محنت ومشقت کے طبعی فرق وتفاوت کے باعث معاشی اونچ نیچ پیدا ہو کر رہے گی۔ جسے ایک حد کے اندر اندر رکھنا معاشرے کی مجموعی صحت اور زندگی کے لئے لازمی ہے۔ اس لئے کہ اگر یہ خلیج زیادہ بڑھ جائے تو معاشرے میں ''مترفین'' یعنی Haves اور ''محرومین'' یعنی Have - nots کے طبقات پیدا ہو جائیں گے جو طبقاتی کشمکش کا باعث بنیں گے اور اس سے معاشرہ شکست وریخت کا شکار ہو جائے گا۔ چنانچہ اسی ضرورت کے تحت مغرب کے سرمایہ دارانہ نظام نے کہیں'' بے روزگاری الاؤنس'' کے نام سے (جیسے برطانیہ میں ہے) اور کہیں ''ویلفیئر'' کے نام سے (جیسے امریکہ اور بعض یورپی ممالک میں ہے) سرمایہ دارانہ نظام کے ''اندرونی انضباط'' کی کوشش کی ہے جس کی سطح کے اعتبار سے اس اصول کے تحت کہ ''شیطان کو بھی اس کا جائز حق ضرور دیا جائے'' یہ تسلیم کیا جانا چاہئے کہ بعض یورپی ممالک جیسے سویڈن' ناروے اور ڈنمارک ایک بار تو ناقابل یقین بلندی کی حدوں تک پہنچ گئے تھے تاہم چونکہ یہ معاملہ غیر فطری اور غیر طبعی تھا لہٰذا اب کسی قدر نیچے اترنے پر مجبور ہو گئے ہیں۔

شریعتِ اسلامی نے یہی ضرورت زکوٰۃ کے نظام کے ذریعے پوری کی ہے جس کے بارے میں نبی اکرم ﷺ کا نہایت حکیمانہ قول ہے کہ ((تُؤْخَذُ مِنْ اَغْنِیَاءِ هِمْ وَ تُرَدُّ اِلٰی فُقَرَاءِ هِمْ)) (صحیح بخاری' عن ابن عباسؓ) یعنی ''وہ مسلمانوں کے مالدار لوگوں سے وصول کی جاتی ہے اور غربا میں تقسیم کر دی جاتی ہے!'' اور اس سے نہ صرف یہ کہ آزاد معیشت کے ''داخلی انضباط'' کا وہ مقصد بتمام وکمال حاصل ہو جاتا ہے جس کی وضاحت اوپر کی گئی ہے' بلکہ واقعہ یہ ہے کہ اسلامی ریاست فی الحقیقت ایک ویلفیئر سٹیٹ کی صورت اختیار کر لیتی ہے جو ''کفالت عامہ'' کی ذمہ داری جس حد تک قبول کرتی ہے اس کا کسی قدر اندازہ حضرت عمرؓ کے اس قول سے کیا جا سکتا ہے کہ ''اگر دجلہ وفرات کے کنارے کوئی کتا بھی بھوکا مر گیا تو قیامت کے روز عمرؓ ذمہ دار ہوگا''۔

زکوٰۃ کے نظام کی دوسری خصوصیت جو اسے مغرب کے ویلفیئر نظام سے مشابہ کرتی ہے یہ کہ اصولی اعتبار سے زکوٰۃ کی ادائیگی دوسرے صدقاتِ نافلہ کے برعکس افراد کی صوابدید پر نہیں چھوڑی گئی بلکہ یہ ایک خالص ریاستی معاملہ ہے۔ لہٰذا یہ صاحبِ نصاب لوگوں سے جبراً اور پورے حساب کتاب کے ساتھ وصول کی جاتی ہے۔ تاہم یہ معاملہ مصلحتِ عامہ کے پیشِ نظر صرف ''اموالِ ظاہرہ'' یعنی اموالِ تجارت وغیرہ کی حد تک محدود کر دیا گیا ہے اور ''اموالِ باطنہ'' جیسے وہ زیورات یا نقدی وغیرہ جو گھروں میں رکھی گئی ہو ان کی زکوٰۃ کی ادائیگی کو لوگوں کی صوابدید پر چھوڑ دیا گیا ہے کہ چاہیں تو حکومت کے حوالے کر دیں اور چاہیں تو خود ادا کر دیں (چنانچہ ایسے ہی اموال کی زکوٰۃ تھی جس کے بارے میں روایات میں آتا ہے کہ دورِ خلافت راشدہ میں لوگ اسے لے کر پھرا کرتے تھے اور اس کا قبول کرنے والا نہیں ملتا تھا!)

بہرحال ان دو جزوی اور سطحی مشابہتوں کے علاوہ شریعتِ اسلامی کا نظامِ زکوٰۃ مغرب کے ویلفیئر کے نظام سے بہت اعلیٰ اور ارفع ہے' جس کے چند پہلو حسبِ ذیل ہیں:

i) زکوٰۃ عبادت ہے ٹیکس نہیں' لہٰذا جس شخص کے دل میں ذرا بھی ایمان ہوگا وہ زکوٰۃ پوری پوری ادا کرے گا جبکہ ٹیکس سے بچنے کی کوشش ایک قاعدہ کلیہ اور متفق علیہ معاملہ ہے۔ چنانچہ بالکل نماز کی طرح جس کی فرضیت قرآن کی جانب سے ہوئی اور اس کے اوقات و رکعات کا نظام نبی اکرم ﷺ نے عطا فرمایا' زکوٰۃ کی بھی فرضیت قرآن کے ذریعے ہوئی اور اس کے نصاب اور شرح کا نظام آنحضور ﷺ نے متعین فرمایا۔ اور جو لوگ اس نظام میں ردّ و بدل کے جواز کے قائل ہیں وہ اپنی ناسمجھی میں زکوٰۃ کو ''عبادت'' کی بجائے ''ٹیکس'' کی صورت دے کر اس کی اصل روح کو ختم کر دینے کے درپے ہیں۔

ii) نظامِ زکوٰۃ کے اعتبار سے ''اغنیاء'' اور ''فقراء'' کا تعین صرف عرفِ عام میں نہیں چھوڑ دیا گیا کہ مالدار وہی سمجھا جائے جو لکھ پتی یا کروڑ پتی ہو اور فقیر وہی قرار دیا

جائے جسے فاقے آ رہے ہوں یا جو بھیک مانگتا پھر رہا ہو' بلکہ ''نصاب'' کی ایک لائن کھینچ دی گئی ہے کہ جو شخص بھی اس سے اوپر ہے وہ ''غنی'' یعنی زکوٰۃ کا ادا کنندہ (Donor) ہے اور جو اِس سے نیچے ہے وہ زکوٰۃ کا وصول کنندہ (Recipient) ہے۔ چنانچہ اس اصول کی بنیاد پر ایک مکمل سوشل انشورنس کا نظام قائم کیا جا سکتا ہے جس سے معاشرے میں Haves اور Have - nots کے مابین ایک حسین توازن قائم ہو جائے۔

iii) مغربی ممالک میں سوشل انشورنس کا اصل نظام لوگوں کی اپنی ادائیگی یعنی Contribution کی بنیاد پر قائم ہے' ورنہ خالص اور اصل ویلفیئر کی سطح تو بہت ہی کم یعنی صرف Subsistence Level پر ہے' جبکہ زکوٰۃ کے نظام میں اس کے حق داروں اور وصول کنندگان کی جانب سے کسی Contribution کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا اور ہر وہ شخص اس کا حق دار ہے جس کی اپنی مالی حیثیت کسی بھی سبب سے ''نصاب'' سے کمتر ہو۔

iv) تاہم شریعتِ اسلامی نے زکوٰۃ کے نظام میں ایک حسین توازن ایسے پیدا کر دیا ہے کہ زکوٰۃ و صدقات کو ''اَوْسَاخُ النَّاسِ'' یعنی لوگوں کا میل کچیل قرار دے کر نہ صرف لوگوں کو ترغیب دی ہے بلکہ ان کی غیرت کو جھنجوڑا ہے کہ اپنے ہاتھوں کی محنت سے معاش حاصل کر کے خود اپنے پاؤں پر کھڑے ہونے کی کوشش کرو اور لوگوں کے میل کچیل سے اپنے پیٹ مت بھرو۔

چنانچہ اسی معاملے میں مزید زور پیدا کرنے کے لئے نبی اکرم ﷺ نے اپنی ذات اور اپنے خاندان کے لئے زکوٰۃ اور صدقات کو حرام قرار دے دیا۔ تاہم عام لوگوں کے اعتبار سے یہ بھی صرف ایک اخلاقی تعلیم ہے' قانون نہیں۔ البتہ اس سے اس اندیشے کا سدِ باب ہو جاتا ہے جس کے باعث سویڈن جیسے ملکوں کو ویلفیئر کی سطح کو نیچے لانا پڑ رہا ہے' یعنی جب بغیر محنت کئے بھی گزر بسر ہو جائے تو ''زندگی یوں بھی گزر ہی جاتی' کیوں ترا راہگذر یاد آیا'' کے مصداق خواہ مخواہ زیادہ محنت اور مشقت کیوں